ISSN Print: 2394-7500
ISSN Online: 2394-5869
Impact Factor: 5.2
IJAR 2017; 3(10): 26-27
www.allresearchjournal.com
Received: 06-08-2017
Accepted: 07-09-2017

Pushpendra Kumar Nim
Ph. D. Urdu, Research Scholoar. Delhi University, Delhi, India

Correspondence
Pushpendra Kumar Nim
Ph. D. Urdu, Research Scholoar. Delhi University, Delhi, India

احمد ندیم قاسمی بحیثیت افسانہ نگار

Pushpendra Kumar Nim

Introduction

احمد ندیم قاسمی اردو کے عظیم افسا نہ نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے منفرد اسلوب، مو ضو عات کی بو قلمونی، فن افسانہ پر دسترس،وا قعہ اور کردار نگاری میں مہا رت، ماحول اور منظر کی تعمیر و تشکیل میں لفظی پیکروں کی کرشمہ سازی اور نثر میں شاعری کے سبب اپنے ہم عصروں میں خود کو ممیز و ممتاز کیا۔احمد ندیم قاسمی نے شاعری اور افسا نہ دو نوں میں اپنی محویت و ریاضت سے ایسی نما یاں کا میابی حاصل کی کہ اکثر سنجیدہ قارئین سو چتے رہ جاتے ہیں کہ ندیم شا عر بڑا ہے یا افسا نہ نگار؟کس میدان میں اسے زیادہ کامیابی ہوئی اور کیوں؟کس میں اس کی شخصیت کا اظہار زیادہ مکمل اور مو ثر ہے؟ ندیم کے لیے اس طرح کے سوا لات ندیم کی شاعری اور اس کے افسا نوں کے مطا لعے سے اندا زہ ہو تا ہے کہ اس نے ہمیشہ فن اور اس کی تخلیق کے اعلیٰ اور حقیقی تقاضوں کا احترام کیا۔ ندیم ترقی پسند تحریک کے ایک سر گرم اور ممتاز رکن رہے ہیں۔لیکن مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ وہ تنا بڑا ترقی پسند نہیں جتنا بڑا فن کار ہے(اگر چہ مجھے شک ہے کہ ترقی پسندی سے وابستگی کے بغیر وہ تنا بڑا فن کار ہو سکتا ہے)

در اصل ندیم کی ترقی پسندی بھی پریم چند کی طرح اس کی اپنی دریافت ہے۔ وہ پریم چند کی طرح ایک حساس اور درد بھرا دل لیکن ان سے زیادہ ترقی پسند یافتہ سائنسی ذہن رکھتا ہے اور اس ذہن کی تشکیل میں مار کسزم کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد کی حقیقتوں کے ادراک میں وہ پریم چند کی طرح اس کے احساس اور تخیل کا خمیر بھی گاؤں کی مٹی سے بنا ہے اور وہ بھی پنجاب کے گا ؤں کی مٹی سے جو بڑی زر خیز، شاداب اور جمال آفریں رہی ہے۔ اس لیے اس کا احساس و تخیل پریم چند سے زیادہ نازک، لطیف اور حسن پرور ہے۔ نظریاتی سطح پر ندیم کی بعض کمزوریوں کا ذکر اکثر سننے میں آیا ہے۔ گاؤں کی مٹی اور اس کی زندگی سے اس کا والہا نہ پیار ہی در اصل اس کے اجتما عی شعور کا چشمہ ہے۔ ان قوتوں کی جستجو میں جو گاؤں کی زندگی پر اپنے منحوس سائے ڈال رہی تھی وہ گاؤں سے شہر تک پہنچا۔ وہاں اسے جاگیر داروں اور ان کے جابر عالموں کی صف میں وہ زبردست بور ژا اور سامرا جی طا قتیں نظر آئیں جو محنت اور دولت پر حاکمانہ تسلط کے نت نئے منصو بے بنا رہی تھی۔ یہی ایسے متوسط طبقے کی زبوں حالی، اس کے کھو کھلے نظام ،اخلاق اور نفسیات کے مطا لعے کا مو قع ملا۔ تقسیم سے کچھ قبل ہی ملک کے طبقاتی کردار کے بارے میں اس کا شعور واضح اور تیکھا ہونے لگا تھا۔ طبقاتی جبر و ظلم سے انسان کی آ زادی کو وہ سیاسی آزادی سے کم اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ در اصل دوسری جنگ عظیم کے بعد جو پیچیدہ صورت حال پیدا ہوئی اور تقسیم کے بعد رو نما ہو نے وا لے حوا دث سے اس پر جو غبار چھایا ، بے شمار ترقی پسند دانشور اور انقلابی ادیب بھی اس میں بھٹک گئے۔ کچھ قوم پرستا نہ اور دینی سیاست کی نذر ہوئے، کچھ تائب ہوگئے۔ ملک کی اور ساری دنیا کی نئی سیاسی اور سماجی صورت حال پر غور و فکر تو کجا، کتنے ہی ترقی پسند ادیب اور شاعر1950ء اور1951ء میں جیلوں اور تہہ خانوں سے واپس آ کر یاتو صرف ادیب یا شاعر رہ گئے یا پھر وہ بھی نہ رہے۔ ندیم ان چند ادیبوں میں سے ایک ہیں،جس کی طبقا تی فکر اس آزما ئش سے گذر کر کچھ اور روشن ہوگئی۔

اس میں شک نہیں کہ وہ''گڈریا''،''آنندی''،''موذیل''یا'' لاجونتی'' کے مرتبے کی کوئی کہانی نہیں لکھ سکے، لیکن ندیم کی بہترین کہانیاں اردو کے کسی بھی افسا نے کی بہترین کہانیوں سے تعداد میں کم نہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ندیم نے گذشتہ بیس سال میں کوئی

اور صنعتی معاشرے کی تشکیل کی رفتار تیز ہو۔
در اصل افسا نوں میں فنی ضرورتوں کے احساس و شعور کے اعتبار سے ندیم نے اپنے تجربے، مواد، موضوع اور نقطۂ نگاہ کی رہبری کے سوا کسی ترغیب کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ نہ ہی کسی غیر ملکی افسا نہ نگار کی پیروی کی۔ ان کے فن کا عام اسلوب چیخوف اور گور کی کے فن کی ایک صورت ہے۔ ہندو ستا نی ادیبوں میں ندیم کی کہانیوں میں پریم چند ، ٹیگور اور منٹو کے فن کا عکس نظر آ تا ہے۔ گاؤں،کسان اور محنت کش عوام کی زندگی سے اس کی گہری دلچسپی، ہمدردی اور طبقاتی بصیرت پریم چند کی یاد دلا تی ہے۔ آخر میں فن کاری کے میدان میں ندیم کی متعدد کہانیوں کا آ غاز عروج اور انجام منٹو کی مہارت فن کا عکس معلوم ہو تا ہے۔

ایسی کہانی نہیں لکھی جو اس دور کی کہانیوں میں تیسرے در جے کی تخلیق کہی جاسکے،جو مواد پر گرفت، دلچسپی، فضا،کیفیت اور معنویت کے احساس و شعور سے عاری ہو۔اس مدت میں جب ان کے بعض دوسرے معاصرے کا فن جمود و انحطاط سے دو چار تھے۔ندیم کے افسانہ تکمیل وترقی کے مرا حل طے کرتے ہیں۔

افسانہ نگار کی حیثیت سے ندیم کے فنی کمالات کو نظر انداز کرنے کا ایک سبب شا ید یہ ہے کہ اس کے فن میں انفرادیت کے عناصر کچھ دیر میں چمکے۔ وہ بیک وقت شاعری اور افسا نہ دو نوں کو ساتھ لے کر چلے(اور شاید یہ بھی ہو کہ وہ ادیبوں کی گروہ بندی اور باہمی مدح سرا ئی کے دبستان سے الگ رہا)بہر حال اگر شاعر ندیم، افسا نہ نگار ندیم کو اپنا خون جگر نہ دیتا تو اس کا فن اس درجہ کمال کو نہ پہنچتا۔ اس کی اکثر کہا نیوں کے بعض حصے شاعری کی اعلیٰ سطح کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا افسا نہ نگار ندیم نے شاعر ندیم کو کچھ نہیں دیا؟ ممکن ہی نہیں تھا۔’رم جھم‘ کے قطعات میں افسانہ کا افسوس ہی بکھرا ہوا ہے۔ اسی طرح’حلال و جمال‘ اور’شعلۂ گل‘ کی متعدد نظموں مثلاً ’زاویہ نگاہ‘،نوکری پر جاتے ہوئے، ایک چیخ، میں افسا نہ نگار کی حقیقت شعری اس کا اراضی تخیل اور افسا نہ کی تکنیک رچی بسی ہے۔ ان میں زندگی کے آشوب اور قدروں کی آویزش کا جو زندہ احساس ہے،مشاہدے کے جزوی اور تجربہ یا واقعے کو کہانی کا سا مو ڑ دے کر وحدت تاثر کی ترسیل کا جو سلیقہ ہے ،وہ افسا نہ نگار ندیم ہی کا حصہ ہے۔’’چوپال، اور بگولے سے لے کر برگ حنا اور گھر سے گھر تک ندیم کلی کہانیوں کا مطالعہ اسی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ تاریخی ترتیب سے ندیم کی کہانیوں کا مطا لعہ ایک ضخیم ناول کا مطالعہ ہے جس میں گذشتہ تیس سال کے شعور و احساس کے ارتقا کی داستان رقم ہوئی ہے۔ یہ داستان خود ندیم کا ذہنی اور جذباتی سفر بھی ہے ۔انہوں نے اپنی ہر نئی کہانی میں انسان کی اس ازلی معصو میت، آسودگی، مسرت اور محبت کو تلاش کیا ہے جس کے لیے خود اس کی روح تڑپ رہی ہے۔ ان کی پچھلی کہا نیوں کے کردار اگلی کہانیوں میں جنم لیتے اور اس ابدی تلاش کو جاری رکھتے ہیں۔ بدلتے ہوئے پیچیدہ حالات اور حقا ئق میں ان کے جذبے و احساس اور شعور کی کائنات بھی بدلتی اور زیادہ تہہ دار ہوتی جاتی ہے۔ ’چوپال ‘اور’بنگلے‘ میں ندیم نے جو کردار تخلیق کیے ہیں وہ معصوم، سادہ، جذباتی اور جنوں پرور ہیں۔

احمدندیم قاسمی کی کہانیاں پنجاب کی زندگی اور پھر تقسیم کے بعد پاکستانی معاشرے کے مسائل سے تعلق رکھتی ہیں پنجاب کا معاشرہ بنیا دی طور پر زرعی اور جاگیر دارانہ معاشرہ رہا ہے۔ وہاں کل ارا ضی کے کم و بیش نوے فیصد پر جاگیردار اور کاشت کار قابض تھے اور66فیصد کسان صرف دس فیصد اراضی پر یا پھر جاگیر داروں کی مزدوری پر گزر بسر کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد اصلا حات کے با وجود پنجاب میں زرعی نظام کا یہ تضاد کم نہیں ہوا۔اس سے زیادہ وہ پاکستان میں غیر ملکی سر مائے کی در آ مد اور اس کی مدد سے مختلف علاقوں میں صنعتوں کا قیام اور قومی بورژوا طبقے کا وجود میں آ نا تھا۔ اس طبقے کے مفاد اور اس کی ترقی اور بقا کا انحصار اس پر تھا کہ ملک کو جاگیر داری، معشیت اور سے نکال کر جدید تکنیکی اور سائنسی تقاضوں سے ہم آ ہنگ کیا جائے تا کہ زرعی پیداوار میں معتد بہ تو سیع کے ذریعے عوام کی قوت خرید بڑھے اور صنعت کاری